نظمیں

کاسۂ شام

وزیر آغا

کاغذی پیرہن

کاسۂ شام ـــــ نظمیں ـــــ وزیر آغا

وسیم جگنو نے ٹی جے پرنٹرز رایل پارک لاہور سے چھپوا کر
کاغذی پیرہن عظیم مینشن، رایل پارک لاہور سے شائع کی۔

اشاعتِ اوّل	:	۲۰۱۱ء
مشینی خطاطی	:	ورڈ میکرز
سرورق	:	ریاظ
قیمت	:	۱۳۰ روپے

Kasa-e-Sham
(*Urdu* Poetry by *Wazir Agha*)

Printed by:
T. J. Printers, Lahore, Pakistan

Price:
In Pakistan: Rs.130.00
Abroad: US$.8.00 or Euro.6.00 or Poundsterling.5.00

Published by:
Kaghadhi Paerahen
Azeem Mansion, Royal Park
Lahore, Pakistan
Tel: +92.42.36848533 - Cell: +92.0321.4649684
Email: kaghadhipaerahen@hotmail.com
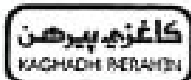
ISBN 978-969-8527-80-8

جدید نظم نگاروں کے نام

ترتیب

اِبتدائیہ

اِختتامیہ

نظمیں

زمانہ طفل؛ لکیروں بھری زمیں تختی
کمال اِس میں کہاں شوخیِ قلم کا ہے

پیش لفظ

وزیر آغا ہر چند کہ غزل، تنقید، اِنشائیے اَور دیگر نثری اَصناف میں بھی کمال حاصل کر چکے، اَور اُن کی ہر تحریر جادُوئی اَثر رکھتی ہے جو قاری کو اَپنے ساتھ بہالے جاتی ہے، تاہم اُن کی پہلی اَور آخری محبت نظم اَور وُہ بھی جدید نظم ہے جس میں وہ دمِ آخر تک (یعنی اٹھاسی ۸۸ برس کی عُمر میں بھی، جب عام طَور پر شاعروں کے تخلیقی سوتے خشک ہو جاتے ہیں) نہایت عُمدہ اَور شان دار تخلیق کاری کا مظاہرہ کرتے رہے جو اُن کے آخری دَور کی نظموں سے عیاں ہے۔

جہاں تک جدید اُردو نظم میں اُن کے فن کا تعلق ہے، اُنھوں نے سب سے پہلے تو زبان کی سلاست میں کمال حاصل کیا ــــ وُہ یُوں کہ اُنھوں نے نظم کو عام گفتگو کی سطح پر اُتار دیا جس میں شعریات کا جادُو جگانا نہایت کٹھن مرحلہ ہے کہ ذرا سی چُوک مصرعوں کو عام نثر کے سانچے میں ڈھال دیتی ہے۔ دوم یہ کہ اُنھوں نے (اِبتدائی دَور کی چند نظموں کے بعد) اِضافت کے اِستعمال سے اِس حد تک احتراز کیا کہ اُن کا کلام بوجھل ہونے کے بجائے نہایت کومل اَنداز میں قاری کے دِل میں اُتر جاتا ہے: کلیشے نام کی کسی شے کو اُنھوں نے نظم میں داخل ہونے کی اِجازت نہیں دی۔ سوم، وہ تشبیہ اَور اِستعارے کا اِستعمال اِس اَنداز سے کرتے ہیں کہ تلازمہ، قوس بھرتے نظر آتا ہے۔ چہارم، وہ علامت کو ذاتی (locale) بنانے کے بجائے اِسے نئے سے نئے امیج کی صُورت میں یونیورسل سطح پر لے آتے ہیں اَور وہ کہ جسے سہلِ ممتنع کہا جاتا ہے، اُن کی نظم میں چلتی پھرتی تصویریں دِکھاتی دیتا ہے (جدید اُردو نظم میں

وزیر آغا کی یہ سب سے بڑی دین ہے) اُور یہی وجہ ہے کہ اُن کی نظموں کے بدیشی زبانوں میں تراجم بہت مقبول ہُوئے جن پر کئی مغربی شاعر، نقاد اُور دانش وَر اُنھیں خراجِ تحسین پیش کر چکے ہیں (دیکھیے کاغذی پیرہن ۱۴' وزیر آغا نمبر)۔ پنجم' اُن کی نظم میں مکالماتی انداز اُس وقت ڈرامائی صُورت اِختیار کر لیتا ہے جب وہ کسی ایک بات کو ختم کرتے ہُوئے دُوسری بات شروع کرتے ہیں ـــ ایسے میں اُن کا فن جَست کا منظر دِکھاتا ہے۔ششم یہ کہ وہ بُحُور پر عُبُور رکھتے ہیں اُور حتیٰ الوسع کوشش کرتے ہیں کہ رُکن کہیں ٹُوٹنے نہ پائے' تاہم چند نظمیں اِستثنائی حیثیت کی حامل ہوتے ہُوئے بھی موسیقی سے لبریز ہیں کہ اُن میں رُکن کا ٹُوٹنا بھی لُطف دیتا ہے۔ اُور آخری بات یہ کہ مصرعوں کی تراش خراش کو بھی اُنھوں نے فن کا درجہ عَطا کر دیا ہے۔

میں نے اپنے اِس مختصر سے پیش لفظ میں' مثالوں سے گریز کرتے ہُوئے صرف شاعر کی نظم کے چیدہ اُوصاف پیش کرنے کی جسارت کی ہے تاکہ قاری کے ذہن پر فوری بوجھ نہ پڑے اُور وہ اِس دیوان کو کھولتے ہی تخلیقات کا مطالعہ شروع کر دے۔ جہاں تک مثالوں کے ذریعے نظموں کی تفہیم کا تعلق ہے' اِس ضمن میں ستیہ پال آنند کا ایک وقیع مقالہ ''پس لفظ'' کے عنوان سے اِس مجموعے میں شامل ہے جس میں اُنھوں نے وزیر آغا کی نئی پُرانی نظموں کا بسیط مطالعہ پیش کیا ہے جو یقیناً قارئین کی دِلچسپی کا باعِث ہوگا۔

شاہد شیدائی

نظمیں

دُور جاتے قافلے نے مُڑ کے دیکھا ہی نہیں
مَیں صدا دیتا رہا، وُہ بے صدا ہوتا گیا

نَو ہی برس میں

نَو ہی برس میں
بخیے سارے ٹوٹ گرے ہیں
چوغے سارے اُدھڑ گئے ہیں!

کسے بتائیں
اَرض وسما میں
کپڑے کی چھانٹوں کے گچھے
بے پَر کی پرواز میں گُم ہیں

یُوں لگتا ہے

جیسے — اَب

اِس عالَم کی پوشاک

گھنے ٹانکوں کے کُھل جانے سے

دھیرے دھیرے

پھیتی پھیتی ہو جائے گی!

کوئی تو ہو؛ ہم جسے بتائیں

اِک دِن اَیسا بھی آئے گا

جب اِس پھٹے پُرانے عالَم

کا اِک نیا لباس سِلے گا

بخیہ گری کا

ایک نیا منظر پھُوٹے گا

اور ہم چھوٹے چھوٹے ٹانکے

پھر سے رقصاں ہو جائیں گے

جُڑنے جوڑنے لگ جائیں گے!!

(۳۰ رجون ۲۰۰۹ء)

نیلام

رات ہی رات میں
تاروں کا جہاں بیچ کے مَیں
کتنے آرام سے سویا ہوں
تمھیں کون بتائے، لوگو!

دُبِّ اکبر کے مِلے ہیں
مجھے اربوں دینار
قُطب تارے کے مگر

چند ہی گاہک تھے وہاں
سمت کے ہونے نہ ہونے سے سبھی تھے بیزار
وہ یہ کہتے تھے کہ اَب
قُطب تارے سے ہمیں کوئی سروکار نہیں!

سُرخ سُورج کے لیے
لاکھوں چلے آئے تھے
وُہ یہ کہتے تھے کہ ہم برق بنا کر اِس کی
اپنے تاریک گھروندوں کو کریں گے رَوشن
سو اُسے ساٹھ ارب
نُقرئی سِکّوں کے عوض بیچ دیا!

مُشتری، زُہرہ، عطارِد کے بھی
گاہک تھے ہزاروں لیکن
کُرۂ ارض کا کوئی بھی خریدار نہ تھا
سب یہ کہتے تھے کہ اِس کھوکھے کو لے کر کوئی
کیا کرے گا کہ اِک اِک کیل ہے اِس کی گِروی
بھیک بھی اِس سے سنبھالی نہیں جاتی اَب تو

تم اِسے تنگ بگُولے کی
کسی جیب میں رکھ دو جا کر
اَور آرام کرو!

سومیں اَب حالتِ آرام میں ہُوں
کیسۂ شام میں ہُوں!!

(ستمبر ۲۰۰۹ء)

پھر یُوں ہُوا ـــــ!

پھر یُوں ہُوا کہ ڈھونڈنے نکلی ہَوا اُسے
بولی: میں اُس کو لے کے پلَٹ آؤں گی ابھی
آخر کہاں وہ جائے گا مجھ سے چھُڑا کے ہاتھ
لیکن وہ اِک چھلاوا تھا' اُس کو پکڑتا کون
اُس کا بدَن تھا دُھند کی خُوشبُو کا پیرہن
دھندلے تھے سارے نقش، دُھواں اُس کی سانس تھی!

آگے بڑھی ہَوا تو وُہ خُوشبُو کا پیرہن
اُس تیز رَو کے خستہ بدَن سے لپٹ گیا
اور یُوں وہ اُس کے ساتھ خود اپنی تلاش میں
اُڑتا پھرا یقین سے حدِ گماں تلک
پاگل ہَوا کو اُس کا پتا تک نہ مل سکا!!

(۲۵ر جولائی ۲۰۰۹ء)

مجھے اَب کچھ نہیں کرنا

مجھے اَب کچھ نہیں کرنا
مجھے کچھ بھی نہیں کرنا
سَحَر کے وقت جب سوئے پرندے
جاگ اُٹھتے ہیں
مجھے خوابوں کی چھتری تھام کر
صَحراؤں کے بنتے بگڑتے
ریت کے ٹیلے نہیں گننا
مجھے نیلے سمندر پر اُتر کر

بادبانوں کو نہیں چھُونا
مجھے پانی کے صحرا میں
سَرابوں کا تماشا بھی نہیں تکنا
مجھے جانا نہیں ہے جنگلوں میں
اُن مہا پُرشوں سے ملنے
جو نہ جانے کب سے
بے لفظی کے دھارے پر روانہ ہیں
مجھے گُنجان شہروں کی بجھی گلیوں
کے اندر بھی نہیں جانا
جہاں آنکھیں دیے بننے کی خواہاں ہیں
مجھے شیشوں کی نگری میں
سیہ سانپوں کی آنکھوں کا
تماشا بھی نہیں تکنا
مجھے کچھ بھی نہیں کرنا
مرے چاروں طرف
آنکھیں ہی آنکھیں ہیں
مجھے اِن اَن گِنت آنکھوں کے پیچھے
بیکراں اک آنکھ کی موجودگی محسُوس کرنا ہے

جو اَصلاً صرف بینائی ہے
جس پر ساری آنکھیں مُرتکز ہیں!
مجھے اِس بیکراں بینائی کے اندر
اُترنا ہے
مجھے اِس کے سوا کچھ بھی نہیں کرنا
مجھے کچھ بھی نہیں کرنا!!

(۱۳رمئی ۲۰۱۰ء)

COMPASSION

اُس نے کہا: کہو تو کچھ!
ہم نے کہا: کہیں تو کیا
کچھ بھی تو اَب نہیں رہا
شام کبھی کی جل بجھی
پھر بھی ستارہ وہ شام کا
آیا نہیں ہے اَب تلک
جانے کہاں وہ مرگیا!
اُس نے کہا: کہیں نہیں،
کہیں نہیں وہ رہ گیا
وہ میری بھیگی آنکھ میں
چمک رہا ہے شام سے
تمھیں خبر نہیں ہے کیا!!

(۲۴ دسمبر ۲۰۰۹ء)

COMPASSION

اُس نے کہا: کہو تو کچھ!
ہم نے کہا: کہیں تو کیا
کچھ بھی تو اَب نہیں رہا
شام کبھی کی جل بجھی
پھر بھی ستارہ شام کا
آیا نہیں ہے اَب تلک
جانے کہاں وہ مَر گیا!
اُس نے کہا: کہیں نہیں،
کہیں نہیں وہ رَہ گیا
وہ میری بھیگی آنکھ میں
چمک رہا ہے شام سے
تمھیں خبر نہیں ہے کیا!!

(۲۴ر دسمبر ۲۰۰۹ء)

چلو آرام کرتے ہیں!

چلو آرام کرتے ہیں
بجھے لفظوں کو پڑھنے کا
قدیمی سخت دھندا
ترک کرتے ہیں
دُکھی آنکھوں میں
بینائی کی بُوندوں کو
ابھی گیلا ہی رکھتے ہیں
کہ ہم کو اَپنی نظروں کے قلم سے
اِس زمانے کے بدَن پر
شوخ رنگوں میں

وہ سب کچھ عام کرنا ہے
جسے ہم نے چُھپا کر
دِل کے اَہراموں میں اپنے
بند رکّھا تھا
مگر ہم نے خزانے کو
کہاں سِم سِم کی چابی سے نوازا تھا
کہ اَب تک کوئی تو
اِس کے معانی تک پہنچ پاتا
مگر شاید ابھی کچھ وقت باقی ہے
سو آؤ ہم بجھے لفظوں کو پڑھنے کا
یہ دَھندا چھوڑ دیتے ہیں
کسی پتّھر کو سِم سِم کی
وہ چابی دان کرتے ہیں
کہ جس سے سیم و زر کے سب کھلونے
سنگ کے سینے سے باہر کو
لپک آئیں گے اِک پَل میں!

(۲۴ مئی ۲۰۱۰ء)

بسنت رُت

فضا میں چیتھڑے کاغذ کے پرّاں ہیں
کئی رنگوں کے کاغذ جو لپکتے
اور جھپٹتے ہیں
یہ اِک دُوجے کے وَیری ہیں
یہ سارے چیتھڑے
خُوں خوار دیووں کی شبیہیں ہیں
جنھیں بے دَرد ہاتھوں نے
بڑے ہی شوق سے تھاما ہُوا ہے

لہو میں تر

کئی ریشم سی کومل گردنیں

اپنے سَروں پر

پھُول سے چہرے سجائے

جُھومتی ہَیں

لرزتے آنسوؤں کا قہقہوں کا

جشن ہر سُو ہے

یہ کیا سرسوں کی رُت ہے

زَرد پھُولوں کا

عجب اِک رقص جاری ہے!

(۱۸/ مارچ ۲۰۰۹ء)

آخری ستارہ

سیہ کالی چادر میں لپٹی ہوئی رات
کل میرے کمرے میں آئی تھی
آتے ہی اُس نے
اندھیرے کو کمرے میں چاروں طرف
پھیلنے کا کہا تھا
مجھے اُس نے
بھاری تہوں والی چادر پہ
اِک کالے اکھر کی صورت اُگایا تھا

اور یہ بتایا تھا:
میں رات کا نطق ہُوں!

مگر رات کی بات
کب مَیں نے مانی تھی پہلے
جو اَب مانتا
سو میں لڑتا رہا رات بھر
رات کی بات سے!

اَور اَب میرے اَندر
یہ احساس جاگا ہے
مَیں کالا اکھر نہیں
مَیں تو آکاش کے کینوس پر
چمکتا ہُوا آخری اِک ستارہ ہوں
آکاش نظروں سے اوجھل ہے
بس میرے ہونے سے
سب کو نظر آ رہا ہے!!

(جنوری ۲۰۱۰ء)

خزاں تُو کہاں ہے!

خزاں تُو کہاں ہے
کہاں ہے بتا!
تیرے پتّے کہ رنگوں کا شہکار تھے
ایک ہی رات میں
بھاری پیڑوں کی شاخوں سے اُترے
اُتر کر زمیں پر بچھے
پیڑ خالی ہُوئے
اور ہوا
زرد اور سُرخ پتّوں کی ہولی رچا کر

اُڑا لے گئی اُن کو بنجر پہاڑوں کی جانب!

اور اَب خاک پر اِک بھی پتّا نہیں
رنگ غائب ہیں
سُورج نکلتا نہیں
چاند سُوکھا پڑا ہے
خزاں! تیرے ہونے سے
پتّوں کے رنگوں کا اُتنا ہی پُر شور میلا تھا
جتنا بہاروں میں پھُولوں کا ہم دیکھتے تھے
خزاں! تیرے پتّوں کی دھیمی دمک
اور بہاروں کی تیکھی چمک میں
وُہی ایک رِشتہ تھا
جو ماں کا بیٹی سے ہوتا ہے
دونوں ہی اَب بے صدا ہیں
تو باقی بتا کیا بچا ہے!
بس اِک مَیلی چادر
جو ساری زمیں پر بچھا دی گئی ہے!!

(دسمبر ۲۰۰۹ء)

ایک پُرانا قلعہ

زین ــــ میری نواسی ہے
چھوٹی سی ہے
پر وہ باتیں مزے دار کرتی ہے
کتنے دِنوں سے وہ آئی نہیں تھی
سو میں نے اُسے
فون کر کے یہ پُوچھا ہے:
بی بی کہاں ہو؟
وہ کہتی ہے: مَیں اَور میری سہیلی

پُرانے زمانے کے اِک فورٹ کو دیکھنے
آج آئی ہیں
گزرے زمانوں نے
حیرت سے دیکھا ہے ہم کو
زمیں میں اُترتے ہوئے خُفیہ رستوں کو
ڈر ڈر کے دیکھا ہے ہم نے
بہت خُوبصورت پُرانی سی بارہ دری سے
لگاتار آتی دُھنوں کی پُراسرار لرزِش
کو ہم نے چُھوا ہے!
بہت یاد ہم نے کیا ہے اُنھیں
جن کو اَب یاد کوئی بھی کرتا نہیں ہے!
یہ سوچا ہے ہم نے ـــــ وہ شہزادیاں
کاش اپنے زمانے کی تاریک مُٹھی سے
باہر نکل کر
ہمارے زمانے کی رَوشن ہتھیلی پہ آئیں
تو ہم اُن کو برگر کھلائیں
کسی پارلر میں
دُلھن کی طرح ہم سجائیں

کوئی خُوبصُورت پلازا دِکھائیں
اُنھیں ہم —
میں کہتا ہوں: اَب چُپ کرو!
تم پُرانے زمانے کے اِس فورٹ کو
دیکھنے کے بجائے
مجھے آ کے دیکھو!!

(جنوری ۲۰۱۰ء)

بگُولا

کیا بتائیں کہ ہم نے کیا دیکھا
اپنی بے نُور سُوکھی آنکھوں سے
دونوں ہی مہرباں؛ زماں ؑمکاں
گُم پڑے تھے خود اَپنی گنجلک میں
سمت ناپَید تھی ــــ کہاں جاتے
کوئی "باہر"، نہیں تھا، کیا کرتے
اَور "اَندر" کا بھی وُجُود نہ تھا
بس بگُولا سا کالی شکتی کا
مَوجزَن تھا اوُر اُس کے جال میں وہ
بُجھ چکے تھے کہ جل رہے تھے ابھی
کس سے ہم پُوچھتے کہ ہم خود بھی
اپنی ہی ٹھوکروں کی زَد پر تھے!

(یکم رمارچ ۲۰۰۹ء)

مہا اَسطُور کے اَندر کہیں!

ہمکتی، شوخ چڑیوں کی صدائیں
کئی رنگوں کی چمکیلی قبائیں
زیبِ تن کر کے،
کِھلونوں کی طرح
اٹکھیلیاں کرتے ہُوئے آئیں
بجھی گلیوں کے اَندر دُور تک
بڑھتی گئیں ــــ اور شہر سارا جی اُٹھا
پھر کِھلکِھلایا!

بنی سنوری صداؤں نے

بُجھی بُجھتی ہُوئی میری کہانی کو
ہزاروں زمزموں کا لحنِ داؤدی
عطا کر کے،
مِری کشتی کو کتنی ہی دُعائیں دے کے،
گہرے پانیوں کے پار کی دُنیا کو
جانے کے لیے رُخصت کیا ہے
کون جانے،
دُوسرے شہروں کی قسمت بھی
چمک اُٹھی ہو
ورنہ یہ بھی ممکن ہے کہ وُہ اَب
تیرگی کی سال خوردہ اِک کہانی
کی سیہ جھالر سے چمٹے
اِک مَہا اُسطور کے اَندر کہیں
گُم صُم پڑے ہوں!!

(۲۱ر ستمبر ۲۰۰۹ء)

مُکتی

جنگل سارے، جھیل کِنارے
آتے ہی رُک جاتے ہیں
اپنے عکس کو دیکھتے ہی
ڈر جاتے ہیں
تم بھی کبھی جو
صبح سویرے، جھیل کِنارے جاؤ
اپنا سایہ دیکھ کے
اُس سے ہرگز ڈر نہیں جانا!

نکتی

جنگل سارے، جھیل کنارے
آتے ہی رُک جاتے ہیں
اپنے عکس کو دیکھتے ہی
ڈر جاتے ہیں
تم بھی کبھی جو
صبح سویرے، جھیل کنارے جاؤ
اپنا سایہ دیکھ کے
اُس سے ہرگز ڈر نہیں جانا!

اُسے بتانا
ہم بہرُوپ نہیں ہیں بھائی
کس نے ہمیں دولخت ہے جانا!

تب تم دونوں
اِک دُوجے کو
اَپنا اَپنا نام بتانا
ایک ہی نام ہے تم دونوں کا!

شام ڈھلے جب سُورج ڈوبے
جھیل اور جنگل اِک ہو جائیں
تم بھی اِک ہو جانا'
اِک دُوجے سے مُکتی پانا!!

(نومبر ۲۰۰۹ء)

دوؔ چہرے

ہر لمحے کے دوؔ چہرے ہیں
اِک وُہ جس کی پیشانی پر
نُور کا قَشقہ رَوشن ہے
تارِ ج کی آنکھ فروزاں ہے
جیسے جیسے لمحہ
غار کی اَندھی دُنیا میں
آگے ہی آگے جاتا ہے
نُورانی ہالے میں اُس کے

ہر شے آجاتی ہے لپک کر
اور پھر دِکھنے لگتی ہے!

دُوسرا چہرہ بُجھا ہُوا ہے
گزرے ہُوئے ایّام کی یادیں
ننھے ننھے دِیے اُٹھائے
اُس کو فروزاں کرنے
دَوڑی آتی ہَیں
پر وہ دِکھائی کہاں دیتا ہے!
آہیں بھرتی پھڑ پھڑ کرتی
ہَولے ہَولے
خود بھی بُجھتی جاتی ہَیں!!

(۱۵/ جون ۲۰۰۹ء)

تخفیف

اِک جہت نا آشنا صُورت
جو صُورت بھی نہیں ہے
وہ اَپنے آپ پر اوندھے پڑی ہے
وہ ایسی بے بدَن ہے
زماں بھی اُس کے مَرقد میں
قدم رکھنے سے قاصِر ہے!

عجب تخفیف ہے وُہ

کسی تقسیم کا اِمکان بھی
جس میں نہیں ہے
"نہیں" کی آخری حد سے بھی آگے
اِک اَیسا بے نہایت عکس جس کا
نہ اَندر ہے نہ باہر ہی کہیں ہے
مجھے دیکھو!
میں اِس تخفیف کو
اوڑھے کھڑا ہوں !!

(۱۲ر فروری ۲۰۱۰ء)

تنکا تنکا کائنات

— اَپنے اِنتظار میں
کھڑا ہوں کتنی دیر سے!
بہم اگر میں ہو سکوں تو چل پڑوں
نجات پاؤں اِس عجیب
صُورتِ فِشار سے
مگر کہاں میں اَپنے انگ
ڈھونڈتا پھروں
کہاں تلاش مَیں کروں

بدن کی پور پور کو
کہاں میں ڈھونڈوں
کھال اُتری ہڈیوں کی کِرچیاں
نشانِ پا کی داستاں کو
کیسے پڑھ سکوں گا مَیں
بِکھرتی، تِنکا تِنکا
ہوتی کائنات میں!!

(۱۱ر مارچ ۲۰۱۰ء)

نشاۃُ الثّانیہ

آنکھیں تیری جانے کب سے
چُپ بیٹھی ہیں
اپنے آپ میں گُم بیٹھی ہیں
کاش، ہوا میں اُڑنے والے
ننّھے نازک تِنکے
اِن آنکھوں میں جھانک کے تکتے!
کچھ تو ہوتا
آنسو، جو اَب سُوکھ چلے ہیں

شاید اِن تنکوں کو چھُو کر

قطرے بنتے، جی اُٹھتے

آنکھوں میں جھیلیں بن جاتے

پھر پانی کے دھاروں میں بٹ کر،

نیچے گِرتے

خشک زمیں کو تَر کرتے

پھر پھُول اگاتے

خُوشبُو کو اُلھڑ جھَونکوں کا رقص سکھاتے

تنکے بن کر

لاکھوں سُوکھی آنکھوں میں

پھر جھانک کے تکتے

پھُولوں کے جنگل اگ آتے!!

(یکم/مارچ ۲۰۱۰ء)

آخری چوٹی سے پہلے!

کون گنے درجات سفر کے
جن کا کوئی اَنت نہیں ہے
ہر درجہ اِک چوٹی ہے اور
ہر چوٹی پچھلی چوٹی سے اُونچی ہے
چوٹی سے چوٹی تک
جستوں کی ہے مسافت، جس میں
قدموں کا کوئی نقش نہیں ہے
پہلی چوٹی

ہریالی سے اَٹی ہُوئی ہے
آخری چوٹی کہیں نہیں ہے
آخری چوٹی سے کچھ پہلے
ہر چوٹی پر برف لدی ہے
برف نے اُس کا سارا بدَن خود آپ تراشا ہے
چاروں حُجرے دِل کے اُس نے بند کیے ہیں
برف لدی ہر چوٹی اَب اِک لاش ہے، جس کا
برف نے خود ہی میک اَپ کر کے
اپنا رنگ دِکھایا ہے!!

(۸/اپریل ۲۰۱۰ء)

دُکھ کی مَیلی دُھند کے اَندر

دُکھ کی مَیلی دُھند تو جیسے
چُرمُری اِک پھڑپھڑ کرتی چادر ہے
جو سبز زمیں پر آن گری ہے
دُور اُفق پر جہاں زمیں
آکاش کو چُھو کر خوش ہوتی تھی
اِک روشن رنگ رُوڈ کی صُورت
ہم کو دِکھائی دیتی ہے
وہاں تلک بھی

دُھند کی میلی چادر
ہر سُو پھیل چکی ہے
دُور اُفق کی کھڑکی کے پٹ
بند پڑے ہیں
کھڑکی، جس کی جھری سے گزر کر ہم
آفاق کے اندر تک جا سکتے تھے!

عجب سماں ہے
دُکھ کی دُھند کے اندر ہم سب
اِک دُوجے کو ڈھونڈ رہے ہیں
دیکھ نہیں سکتے ہیں لیکن
دُھند میں لپٹے
اِک دُوجے کی
خُوشبُو کو تو سُونگھ رہے ہیں!!

(۲۰۰۹ء)

خاکِ شفا

مَیلے کاغذ کے پرتوں کے اَندر
وُہ چاندی کے ورَق کی صُورت
بند پڑا تھا
لیکن اَب وُہ
قَند کی پیشانی پر جیسے
تارا بن کر چمک اُٹھا ہے
کتنے ہاتھ بڑھے ہیں اُس کی جانب
اوِر وُہ دھجّی دھجّی ہو کر

مُنہ کے کھرَل کے اَندر
پِس کر
اپنی بھاری
گُنجلک سے آزاد ہُوا ہے
خاکِ شِفا کہلایا ہے
تُو کیا جانے
کتنے رنگ مِٹا کر اُس نے
کیسا رنگ جمایا ہے!

(۲۹ر مارچ ۲۰۱۰ء)

غُنُودگی

غُنُودگی کو اوڑھ کر وہ سو گئے
تو خواب پھڑپھڑا کے جاگنے لگے
غنُودگی کا سایباں جُھکا ہُوا تھا چارسُو
مگر وہ خواب بھی عجیب تھے
کہ سایباں کو تار تار کر گئے
عجیب گول ہیئتوں میں ڈھل گئے
زمیں سے اُڑ کے آسماں کی سمت
دُور دُور تک گئے

کہاں گئے' پتا نہیں
وہ خواب تھے
وہ آسماں کا رِزق تھے' چلے گئے!

غُنُودگی کہاں ہے اَب
غنودگی خُمار تھی' خُمار خواب لے گئے
غُنُودگی جو بچ گئی
وہ ہَولے ہَولے بُجھ گئی
زمیں کا رِزق بن گئی!!

(۱۴/اپریل ۲۰۱۰ء)

ہَوا تم سے کہے تو!

ہَوا تم سے کہے رُک جاؤ
تو ہرگز نہیں رُکنا
ہَوا سے کہنا' پہلے خود رُکے
پھر تم سے رُکنے کا کہے
کیسے مگر تم سے کہے
اُس کو پتا ہے' جانتی ہے
وُہ رُکی تو رُکتے ہی مَر جائے گی
مَر گئی تو ساری دُنیا

خاک میں مِل جائے گی

پر جانتے ہیں سب کہ جب
پنکھا وہ جھلتی ہے
تو ہر شئے سانس لیتی ہے
سمندر جھولتے، صحرا اُچھلتے
سبز جنگل گنگناتے ہیں
اُنھیں جھک کر جگاتے ہیں
جو بھاری چھاؤں میں
چُپ چاپ بیٹھے ہیں
جو اپنی خواہشوں کو
لَب کُشا ہونے نہیں دیتے!

ہَوا تم سے کہے رُک جاؤ
تو ہرگز نہیں رُکنا
کسی صورت نہیں رُکنا!!

(۱۹؍ مارچ ۲۰۱۰ء)

زمانے کو رستہ دِکھانے لگا ہے!

وہ جس نے کبھی
اپنی عُمرِ سُبک رَو کو مَرکب بنا کر
فقط ایک جلتی ہُوئی موم بتی کے گرد
اِک پتنگے کی صُورت، ہَوا کی طرح
تیز تر ہونا سیکھا تھا
تم نے جسے
ریزہ ریزہ زمانوں کے قدموں سے اُڑتی ہُوئی
دُھول تک کہہ دیا تھا

وہی آج اِک سبز سی رَوشنی بن کے
اپنے ہی پنجر کی
ٹوٹی سلاخوں سے باہر نکل کر
بُجھی کور آنکھوں کے حُجروں میں رکھّے
دِیے
دھیرے دھیرے جلانے لگا ہے
زمانے کو رَستہ دِکھانے لگا ہے!

(۲۰/دسمبر ۲۰۰۹ء)

سنّاٹے سے خوف نہ کھاؤ!

سناٹے سے خوف نہ کھاؤ
سناٹا تو خود ہی تم سے خوف زدہ ہے
تن کی دراڑوں اور چاکوں سے
سہمتے ، رِستے
سینے کی پاتال میں گر کر
چُھپا پڑا ہے
سناٹے کو کُھلی فضا میں آنے دو
ملنے دو اُسے

کُہرام بھری آوازوں سے
اور دھوم مچاتی چیخوں سے !

سنّاٹے کا کام یہی ہے
آوازوں اور چیخوں کو
ہاتھوں سے تھپکنا
لوری دینا
میٹھی نیند کے ہلکوروں سے
بھاری نیند کے تہ خانوں کی راہ دِکھانا
سنّاٹے سے کیوں تم اِتنا ڈرتے ہو!!

(۲۰۰۹ء)

سچّی جھوٹی بات!

سچی بات کو سچ مت جانو
سچی بات بھی
تھوڑی سی جھوٹی ہوتی ہے
سونے کے لاکٹ میں جیسے
کھوٹ نہ ہو تو
لاکٹ کھوٹا لگتا ہے
اپنی شوبھا کھو دیتا ہے
شب کو چمکنے والے تارے

موتیوں ایسے دِکھتے ہیں
پر رات کی کالی چادر پر ہی
ہم کو دِکھائی دیتے ہیں
سچ اور جھوٹ کا ساتھ پُرانا
کتنا پُرانا لگتا ہے!
خالص سچ ـــــ بے داغ اِک چہرہ
خالص جھوٹ ـــــ مجسّم کالک
"سچی جھوٹی بات" ـــــ مگر
اِک چیز الگ ہے
جس کی چِتّی کالی چادر
سُوکھی بنجر دھرتی پر
ہریالی بنتی جاتی ہے!!

(۱۶ر جون ۲۰۰۹ء)

آسیب

عجب مکاں ہے، عجب مکیں ہیں
عجب ہے مالکِ مکان جس نے
کبھی نہ نوٹس ہی اُن کو بھیجا
نہ فون پر گڑگڑایا، چیخا
نہ خط ہی لکھ کر اُنھیں ڈرایا
عجب ہے مالکِ مکان جس نے
کبھی نہ دھمکی کا جال پھینکا
کبھی نہ آیا وکیل جس کا!

اور اَب سُنا ہے، وہ جا چُکا ہے

مگر کہیں بھی نہیں گیا وُہ
کہ وُہ تو دہشت میں ڈھل گیا ہے
مُہیب سایوں کا رُوپ دھارے
اِک اِک مکاں میں اُتر گیا ہے
دِیے گھروں کے بُجھا گیا ہے!!
(۴/اپریل ۲۰۱۰ء)

تعاقب

مرے ہر قدم سے
نیا اِک سفر پھُوٹتا ہے
سفر جو سیہ رنگ سنپولیے کی طرح
کچّی بھیگی زمیں پر بچھی
جھاڑیوں کی طرف
پیچ کھاتے ہُوئے دوڑتا ہے!

میں پکّی سڑک چھوڑ کر
اُس کے پیچھے لپکتا ہوں

بھیگی زمیں پر بچھی جھاڑیاں
مجھ کو آتے ہُوئے دیکھ کر
جُھومتی ہیں!
اور سبز چڑیاں
خوشی سے پَروں کو ہلاتے
مری سمت آتی ہیں
پر مَیں تو سپنولیے کے تعاقب میں
پاگل ہُوا ہُوں!

گھنی جھاڑیوں سے نکلتے ہی
مَیں کالے گُنجان جنگل کو
اپنی طرف گُھورتے دیکھتا ہُوں
وہ جنگل جو قرنوں ہوئے اِک چمن تھا
جسے چھوڑ کر مَیں
خود اَپنے ہی اَندر کے جنگل میں
داخل ہُوا تھا
مگر آج مَیں اَپنے باہر کے جنگل
کے اَندر پھنسا

کُبڑے پیڑوں کے خُوں خوار جبڑوں

سے بچ کر

گرے سوکھے پیڑوں کے لاشوں سے

خود کو بچا کر

گوریلوں کو شیروں کو جُل دے کے

گیلی زمیں پر پھسلتے ہُوئے

کالے اژدر کے پیچھے رواں ہُوں

جو نظروں سے اوجھل ہے

پر بھاری پتّوں کے قالین کے

اٹھنے گرنے سے معلوم ہوتا ہے

وُہ بھاری پتّوں کے نیچے ہے

اور جا رہا ہے!

عجب یہ سفر ہے

شِکار اور شِکاری میں جیسے ٹھنی ہو

کوئی کیسے مانے کہ ہم دو۲ ہیں

یا اِک ہی دوڑے چلا جا رہا ہے!!

(نومبر ۲۰۰۹ء)

شجر سے شجر تک

جانے جھنجوڑا کس نے معا صبح کا شجر
شبنم کی بُوندیں پھُول سے چہروں پہ آ گریں
عارضِ ہُوئے گُلال تو آنکھیں چمک اٹھیں
اُتریں لرزتے ہونٹوں سے لفظوں کی پتیاں
اور دیکھتے ہی دیکھتے جُملوں میں ڈھل گئیں
پھر یُوں ہُوا کہ سَیلِ صدا کوہ سے گِرا
سڑکیں صدا کی برچھیاں کھاتے، رواں ہُوئیں
رستوں میں آنے والی حدیں توڑتے گئیں
دیوار و در، ہَوا میں اُڑے ـــ دیر تک اُڑے
زخموں سے چُور شام کے آنے تلک اُڑے!
تب رات کے شجر کو کسی نے جھنجوڑ کر
تاروں کے دیپ شہر میں ہر سُو جگا دیے
اور شہر سارا بُقعۂ انوار ہو گیا!!

(۷؍اگست ۲۰۰۹ء)

سرگوشی نے لَب کھولے

آخر اِک دِن
گھر اَپنے تم لَوٹے
اور پھر لوہے کے بستر کے اُوپر
صَدیوں پُرانی تھکن میں لپٹے
کانچ کے اِک تعویذ کی صُورت
آن گِرے
اور آنکھوں کے سُوجے پَردوں کے
گِرنے سے پہلے ہی

تم مُشتِ خاک ہُوئے!

پھر مُشتِ خاک کی تاریکی میں
سرگوشی نے لَب کھولے
حیرت سے دیکھا اور پُوچھا:
کون ہو تم —
اِتنے لمبے برف دِنوں کے بعد
یہاں تم کیا کرنے آئے ہو —
واپس جاؤ،
اور مجاوَر بننے کا، گر شوق ہے تم کو
اَپنے اَندر کے مَرقد پر دِیا جلاؤ
جس میں تم قرنوں سے
حنُوط پڑے ہو!!

(۱۵/ اپریل ۲۰۱۰ء)

خاک میں مل کر خاک!

پروین طاہر کے لیے

آنسو اُس کے خشک ہُوئے تھے
اور پھر زخمی چیخیں
گھر کی دیواروں سے ٹکرائی تھیں
پھر یک دم اُن چیخوں نے
کتنے ہی رستے ڈھونڈ لیے تھے
مخفی درزوں اور جھریوں سے
باہر کی جانب لپکی تھیں
سناٹے کے کوہِ گراں سے ٹکرائی تھیں

آہوں کا اِک گرم بگُولا بن کر
چکّر کھاتے،
اُوپر ہی اُوپر کو اُٹھتے
عرش کے پایے سے ٹکرا کر،
ڈھیر ہُوئی تھیں
دھیرے دھیرے
خاک پہ واپس آن گری تھیں،
خاک میں مل کر خاک ہُوئی تھیں!

(۰۵/ اپریل ۲۰۰۹ء)

فرخندہ لودھی کی شدید علالت پر

شام، ہوا اور بستر پر اِک کترن پتّے کی
ٹوٹے پھوٹے سبز کھلونے خوابوں کے ہر سُو
کچھ پیڑوں کے سائے میں اور باقی رستوں پر
چلو چلیں اور ہار پرو دیں اُن سب خوابوں کے
ورنہ وُہ کب ہاتھ آئیں گے ہم دُکھیاروں کے!

(۱۹؍اگست ۲۰۰۹ء)

اختتامیہ

کُوزوں کے ساتھ، ہم بھی تھے بکھرے پڑے وہاں
اُس شہرِ بے مثال کے آثار ہم بھی تھے

پس لفظ

سٹیفن سپینڈر لکھتا ہے کہ اُس نے ٹی ایس ایلیٹ سے اُس کی وفات سے دو برس پیشتر، یعنی ۱۹۶۴ء میں اِستفسار کیا:

کسی بھی شاعر کی پہلی کچّی بلوغت کی شاعری میں، جسے عام طور پر اُس کا juvenalia کہا جاتا ہے، اور آخری دور کے کلام میں، جسے paternalia کہا جاسکتا ہے، کیا بہت زیادہ فرق ہوتا ہے؟

نہیں اور ہاں......

ایلیٹ نے کہا:

نہیں اس لیے کہ شاعر تو پیری میں بھی وُہی اِنسان ہوتا ہے جو وُہ شروع جوانی میں تھا، اور ہاں اِس لیے کہ ایک درخت کے گانٹھوں سے بھرے تنے کی طرح عُمر کی "بازو پٹیاں" اُسے مضبوط، دندانے دار اور مکروہ بنا دیتی ہیں۔

مکرّر اِستفسار پر ایلیٹ نے کہا:

اُس کی حیثیت تو وُہی رہتی ہے جو پہلی بلوغت میں تھی، لیکن اسلوب اور اندازِ بیاں میں وُہ خود سے اِنحراف کرنے لگتا ہے۔

مَیں لگ بھگ نصف صدی سے وزیر آغا کی نظمیں پڑھ رہا ہُوں۔ یہ سُطُور لکھنے سے پہلے میں نے

اِن نئی نظموں اُو اُن کے پُرانے شعری مجموعوں کی نظموں کو آمنے سامنے رکھ کر' ایلیٹ کے فرمان کی رَوشنی میں دیکھا تو جہاں مجھے کچھ اَیسے نکتے نظر آئے جو اُنھیں پُرانی نظموں سے اگر ممتاز نہیں تو کسی حَد تک مختلف ضرور بناتے ہیں' وہاں دندانے دار بکرُوہ ہونا تو دُور کی بات' گانٹھوں سے بھرے تنوں کی بازو پٹیاں بھی کہیں نظر نہ آئیں۔ ایلیٹ نے اَسلُوب اُو اَندازِ بیاں کی بات شاید اُنیسویں صَدی کے شعرا، خصوصی طَور پر ورڈز وَرتھ کی مثال سامنے رکھ کر کی' اِس لیے اُسے ایک قانون یا ضابطے کی شکل دینا موزوں نہیں۔ جہاں تک وزیر آغا کی نئی نظموں کا تعلق ہے' موضوع اَور مضمون سے قطع نظر' اُن کے اَسلوب اَور اَندازِ بیاں میں پہلے سے بھی زیادہ سادہ وَضعی' سلاست اُو زیب و زینت سے عاری شگفتگی ہے۔

میں نے اُوپر اَسلوب اُو اَندازِ بیاں کے حوالے سے "سادہ وَضعی" اَور "زیب و زینت سے عاری شگفتگی" ایسے اَلفاظ اِس لیے اِستعمال کیے ہیں کہ بیس تیس برس پہلے کی نظموں میں بھی وُہی بے تصنّع لیکن جاذبِ نظر اَلفاظ کا اِستعمال ہے جو نئی نظموں میں نظر آتا ہے {یعنی اُن نظموں کے اَسلوب میں بھی اِضافت سے کنارہ کشی' سابقوں اَور لاحقوں سے اِجتناب' دبیز ملفوفیت اَور پیچ دار مدوّریت سے اِحتراز' بوجھل فارسی اَور عربی ترکیبوں سے حذر' اَور غزل کے توشہ خانے سے مُستعار کلاسیکی اَور نیم کلاسیکی کلیشے زدہ (cliche ridden) زبان سے دامن کشی ہے' اَور عبارت آرائی اَور راست گفتاری کہیں نظر نہیں آتی } ــــــ اِس کا اَندازہ کسی بھی باشعور قاری کو یہ نظمیں پڑھتے ہُوئے ہو جاتا ہے کہ اِن میں سادگی' سادگی ہی رہتی ہے، پُرکاری نہیں بنتی۔

وہ کیا نکتے ہیں جو اِنھیں "نردبان"، "اِک کتھا انوکھی"، "عجب اِک مسکراہٹ" یا "یہ آواز کیا ہے" میں شامل نظموں سے کسی حَد تک مختلف بناتے ہیں ــــــ اِس سوال کا تعلق جہاں بالغ نظری کی اُس آخری معراج سے ہے جس تک بُودھی بصیرت کی تلاش میں نکلا ہُوا کوئی تتھاگت ہی پہنچتا ہے' وہاں اِس کا کچھ سمبندھ اُس تکان سے بھی ہے جو آٹھ نَو دہائیوں کا لگاتار سفر کسی بھی راہ رَو کے پاؤں بوجھل بنا دیتا ہے اَور کبھی کبھی ایک آدھ سانس کے وقفے میں قدموں کی نپی تلی رفتار کا ماند پڑنے کا اِمکان بھی نظر آنے لگتا ہے؛ لیکن فی الحال اِس بحث کو کسی اَور موقع پر اُٹھا رکھتے ہیں۔

(۲)

آج سے بارہ تیرہ برس پیشتر "عجب اِک مسکراہٹ" کے پیش لفظ میں وزیر آغا نے کچھ باتیں کہی تھیں جن کا اطلاق اپنی نظموں پر نہ کرتے ہُوئے بھی وُہ یہ عندیہ دے رہے تھے کہ اپنے نصف صدی یا اِس سے بھی زیادہ عرصے کے شعری سفر میں اُنھوں نے جو مراحل طے کیے' اُن کا لیکھا جوکھا (ذاتی حوالہ دیے بغیر) کرنا زیادہ معتبر ہے۔ اُس پیش لفظ کو ایک نظر دیکھنے کے بعد یہ باوَر کرنے میں کوئی تردّد نہیں کرنا پڑتا کہ وزیر آغا اپنے ہی بارے میں "سہج سُبھاؤ" سے باتیں کہ رہے ہیں ـــــ کچھ اِقتباسات کا دُہرایا جانا ضروری ہے:

> وُہ شاعر جو محض "باہر" کا ناظر ہے' اُسے بصارت تو مِل جاتی ہے مگر وُہ بصیرت سے بالعموم محروم ہی رہتا ہے؛ اور وُہ شاعر جو صرف "اندر" کی طرف دیکھتا ہے' اُسے بصیرت تو نصیب ہو جاتی ہے مگر اُس کے ہاں بصارت فعّال نہیں ہوتی۔
>
> تاہم جب شاعر ایک ایسے مقام پر آ کھڑا ہو جہاں بصارت اور بصیرت باہم آمیز ہو جائیں' تو اُس کے ہاں ایسی "شعری آگاہی" پیدا ہوتی ہے جو کائنات کو ٹکڑوں میں بانٹ کر دیکھنے کے بجائے اُسے ایک 'نامیاتی کُل' کے طَور پر دیکھنے پر قادِر ہوتی ہے۔ شعری آگاہی' شے اور اُس کے عکس کو ایک دُوسرے سے الگ نہیں کرتی اور نہ ہی ایک کو برتر اور دُوسرے کو کمتر گردانتی ہے: اُس کے نزدیک دونوں کے جُڑنے ہی سے "کُل" تشکیل پاتا ہے ـــــ ایک کے بغیر دُوسرے کی تفہیم ناممکن ہے۔
>
> ـــــ عہد نامہ قدیم کے مطابق خُداوند نے کائنات کو گھراؤ (مُراد Primeval Chaos) سے پیدا کیا (جس کا مطلب یہ ہے کہ اُس کے سامنے کائنات کا کوئی بلیو پرنٹ موجود نہیں تھا)' مگر جب کائنات کی تخلیق ہوگئی اور اِس کے ساتھ ہی اِس کا بلیو پرنٹ بھی خلق ہوگیا' جو طبیعیات کے قوانین پر مشتمل تھا' تو اُس نے اِسے ایک نظر دیکھا (گویا اِس کی قرأت کی) اور برملا کہا کہ کائنات اچھی ہے' یعنی خُوبصورت ہے (یہ جمالیاتی معیار کی اِبتداتھی)۔ یہی شاعر بھی کرتا ہے اور اِسی لیے اُسے تلمیذُ الرحمٰن کا نام مِلا ہے کہ وُہ اپنے اَندر کی "منظّم پیچیدگی" کی مدد سے (جو Aesthetical Compressible ہے) ایک ایسی شِعری کائنات تخلیق کرتا ہے جس میں موجودگی (مُراد Concreteness) بھی ہوتی ہے مگر ساتھ ہی جس کا ایک سایہ' عکس یا معنیاتی پیٹرن بھی ہوتا ہے۔

لیکن یہی شاعر جب تلمیذُ الرحمٰن کا جامہ اوڑھتا ہے اَور لگا تار چالیس پچاس برس تک دھیان میں ڈوبنے اَوُ زین بدھ مَت کا اَندرونی معبد تلاش کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو اُسے لگتا ہے کہ ماحاصِل تک پہنچنے کی یہ سَعی اَنت میں لاحاصلی کا جامہ اوڑھے دِکھائی دے رہی ہے۔ اُسے گیان کی ایک اَور کرن اِس گمان میں مبتلا کر دیتی ہے کہ ماحاصِل ہی اَنت نہیں' اَوُ اگر ہے تو اِس اَنت کے آگے ایک اَوُ اَنت بھی ہے۔ جس تک شِعری وسیلے سے پہنچنا اگر ناممکن نہیں تو کٹھن ضرور ہے۔ اِس پڑاؤ پر تلمیذُ الرحمٰن کو بھی بسا اَوقات تخلیقی قوت کی کارکردگی کے عمل میں اپنے اَندر کی منظم پیچیدگی بُری لگنے لگتی ہے' جیسے وُہ abstract اَوُ concrete کے بیچ میں معلّق' اپنے ہی اَندر اَوُ باہر کے آفاق کے درمیان' ایک اَن ہونے خَلا میں کھڑا ہو' اَوُ اُسے سہارے کے لیے کسی دیوار کی ضرورت ہو' پائے لنگ کے لیے ایک بیساکھی درکار ہو' آنکھ کی پتلی پر وارِد ہونے کے لیے اَوُ substance کے وُجود کے ثبوت کے طَور پر کم اَز کم اُس کے shadow کی حاجت ہو۔ اُسے اَندر کا خالی خُولی space-time continuum نہیں چاہیے' اگیان اَور گیان کے اِنسلاک سے اگر کچھ بنتا ہے' چاہے وُہ کبیر کی جھینی چدریا نہ ہو' اُس کی کھڈی کا صرف ایک تاگا ہی ہو' لیکن جسے وُہ دیکھ سکے' بُن سکے' چُھو سکے' سُونگھ سکے' توڑ سکے' یا توڑ کر پھر بنا سکے۔

حتمیّت یا قطعیت کو بھی وُہ اَیسے ہی نامنظور کرنا چاہتا ہے' جیسے کسی وقت اُس نے عدمِ وُثوق اَوُ دُبدھا کو کیا تھا۔ بیس پچیس برس پُرانی نظم "بہت اَندر کی دُنیا دیکھ لی" اِسی صُورتِ حال کی ترجمانی کرتی ہے:

بہت اَندر کی دُنیا دیکھ لی
باہر بھی اَب دیکھیں
سمندر کی ہَوا پھانکیں
مکانوں پر لکھے نمبر پڑھیں
کھوئے ہُوؤں کو رات بھر ڈھونڈیں
جلائیں آگ
ٹھنڈی راکھ سے لبریز چُولھے میں
سُنیں بھُوری' پُرانی کیتلی

کے بجتے دانتوں سے
نکلتی بھاپ کی آہیں
اُٹھائیں فرش سے چڑیا کا ٹوٹا گھونسلا
پھر فریم لکڑی کا
نکالیں فریم کی
کمزور مُٹھی میں پھنسی تصویر
جس کے نقش سارے بجُھ چکے ہیں
سُنیں اَندھے مکاں کی تہ سے آتی
پھُول سی زخمی صدا
تِتلی کی صُورت
نرم پنکھوں سے ہمیں چھُوتی
یقین و بے یقینی سے گزرتی!

کہیں: ہم لَوٹ آئے ہیں
نکل آئے ہیں ہم
اپنے بدن کے تنگ مَعبد سے
کہیں اُس سے کہ تم بھی
اَب نکل آؤ
زمیں کی راکھ ہوتی قبر کے
بے نُور محبس سے ــــ!!

(مشمولہ عجب اِک مسکراہٹ، ص ۶۶/۶۷)

میں نے اِس نظم کو وزیر آغا کی چار دہائیوں پر مشتمل اِس سے پہلے کی نظموں سے الگ کرکے شاید اِس لیے منتخب کیا ہے کہ مجھے یہ نظم شاعر کے طویل شعری سفر کے بعد departing point کی سی محسُوس ہُوئی جس کے کہ اس سے مجھے آگے کا راستہ تلاش کرنے اَور اُن کی نئی نظموں کو پڑھنے اَور حتیٰ الوسع پرکھنے میں مدد ملے گی۔

بیسویں صدی کے اوائل کی اِنڈو اَینگلین (Indo-Anglian) پوئٹری کے ممتاز شاعر اور ہندو فلسفے کے ماہر سری اوروبندو گھوش (Sri Aurobindo Ghosh) نے اپنی شاعری کے مختلف اَدوار کا لیکھا جوکھا کرتے ہُوئے لکھا تھا:

> I have always been in search of the light at the end of the tunnel in my inner self, a tunnel that I had myself dug - may be to reach the other end and to find if there was an opening. For forty years my *dhyana* could only flaunder about in darkness to reach *jnana* but whenever I thought the light was in my grasp, I found that it was the same opening of the tunnel I had started from. Did I traverse in vain? Did I walk in darkness only to reach the light I had left behind? Was the effort wasted? No, it was not, but yes, probably it was; but the labour was worth it.

(۳)

یہ نئی نظمیں جو اِس مجموعے میں شامل ہیں، اِن میں سے کچھ اِس اَمر کی صداقت پر دال ہیں کہ شاید وزیر آغا کو بھی "دھیان" سے "گیان" تک کے سفر میں آخرش یہی احساس ہُوا ہو کہ رَوشنی اُن کی مُٹھی میں آتے ہی پھسلتے ہُوئے اُنھیں ایک ہیُولا سا دِکھا کر کہہ گئی ہو:

مُسافر، تیرا سفر تو باہر سے اَندر ہوتے ہُوئے بھی اَندر سے واپس باہر کی طرف تھا ـــ تُو کیوں بھٹکتا رہا!

اَور جواباً وزیر آغا نے اوروبندو گھوش کے الفاظ ہی میں خود سے کہہ دیا ہو:

No, it wasn't that, but even if it was, the candle was worth the light.

وزیر آغا کی صرف چند نظمیں ایسی ہیں جن کے معانی ظاہری سطح پر تو زوالِ عُمر کے حوالے سے اَخذ کیے جا سکتے ہیں لیکن جن میں زیریں سطحوں پر اِس مفروضے کا اِطلاق نہیں ہو سکتا (واضح رہے کہ میں نے اُن کی سب نئی نظموں کو اِس تناظر میں نہیں دیکھا)۔ اُن میں ایک نظم "خزاں تُو کہاں ہے" بظاہر تو خزاں کے موسم سَرما میں بدل جانے کا نَوحہ ہے لیکن بینُ السطور زوالِ عُمر کے احساس سے کہیں آگے جا کر جسم اَور رُوح کے اِشتراک کو درختوں اَور اُن کے پتّوں کے اِستعارے کے حوالے سے دیکھنے کی سَعی ہے:

خزاں تُو کہاں ہے
کہاں ہے بتا!
تیرے پتّے کہ رنگوں کا شہکار تھے
ایک ہی رات میں
بھاری پیڑوں کی شاخوں سے اُترے
اُتر کر زمیں پر بچھے
پیڑ خالی ہُوئے
اور ہَوا
زرد اور سُرخ پتّوں کی ہولی رچا کر
اُڑا لے گئی اُن کو
بنجر پہاڑوں کی جانب!

بہار کے خزاں میں بدلنے کا نَوحہ تو اُردو کی غزلیہ شاعری کا پسندیدہ شغل ہے لیکن ادھیڑ عُمر سے آگے عُمر کا وُہ پڑاؤ، جسے مہاکوی تلسی داس نے "گہن بڑھاپا" کہا ہے، اَور کبیر نے "اگن شریر کی مند بھیو، بوڑھو بھیو کبیر" کہہ کر دیا کھیا کی ہے، بہت کم شاعروں کا پسندیدہ موضوع رہا ہے۔

اِسی طرح "ایک پُرانا قلعہ" ہے جس میں اسم ضمیر "مَیں" کے توسّط سے ایک پُرانے قلعے کی مشابہت خود سے کی گئی ہے اَور کہانی کے پس منظر میں مشابہ اَور مشابہ بہٖ دونوں خوبصورتی سے اُبھر کر سامنے آتے ہیں۔ واحد متکلّم کی نواسی پُرانے قلعے کے رومانس کو شہزادوں اَور شہزادیوں سے جوڑتے ہُوئے کہتی ہے:

بہت یاد ہم نے کیا ہے اُنھیں
جن کو اَب یاد کوئی بھی کرتا نہیں ہے!
یہ سوچا ہے ہم نے ـــــ وہ شہزادیاں
کاش اپنے زمانے کی
تاریک مُٹھی سے باہر نکل کر
ہمارے زمانے کی
روشن ہتھیلی پہ آئیں

تو ہم اُن کو برگر کھلائیں
کسی پارلر میں
دلھن کی طرح ہم سجائیں
کوئی خوبصورت پلازا دِکھائیں
اُنھیں ہم —

اَور شاعر (یا اُس کے واحد متکلم کا ایک رُوپ) جیسے اِس کہانی کو سنتے سنتے اَور خود کو ایک قدیم قلعے کی طرح دیکھتے دیکھتے یک دم اُس بچّی کو محبت بھری ڈانٹ کے لہجے میں کہتا ہے:

— اَب چُپ کرو!
تم پُرانے زمانے کے اُس فورٹ کو
دیکھنے کے بجائے
مجھے آ کے دیکھو!!

یہ کہنا شاید درست ہی ہو کہ ایسی نظمیں ہم جیسے اُن سب شاعروں کا مقدر ہیں جو زوالِ عُمر کا شکار ہیں۔ لیکن جس چابک دستی سے وزیر آغا ایک پیرابل (parable) کے چَوکھٹے میں جُڑ کر ناسٹیلجیائی کیفیت کو اِس نظم میں پیش کرتے ہیں، وہ ناسٹیلجیا سے کچھ آگے بڑھتے ہوئے کئی سوالیہ نشان چھوڑ جاتی ہے۔ پُرانا مضبوط قلعہ، بارہ دری، خفیہ راستے، دیرینہ دُھنوں کی پُراَسرار لرزِش — اسمِ ضمیر "مَیں" کو بنفسِ نفیس وزیر آغا نہ بھی بنائیں، تو بھی ایک پُرانے قلعے کی بھُولی ہُوئی تاریخ کی طرح اُس کی گزری ہُوئی بھرپور، مضبوط، پُراَسرار موسیقیت سے لبریز زندگی کا منظر نامہ پیش کرتے ہیں۔

(۴)

اِسی قبیل کی دو اَور نظموں "چلو آرام کرتے ہیں" اَور "نَو ہی برس میں" کا ذِکر بھی ضروری ہے۔ اوّل الذکر نظم کو اِس بات سے قطع نظر کہ سطروں کی قطع و برید صَوتی محاکات کا جُزوِ لاینفک ہے، میں نثری انداز میں لکھ کر دیکھتا ہوں:

چلو آرام کرتے ہیں ـــ بجھے لفظوں کو پڑھنے کا قدیمی سخت دھندا ترک کرتے ہیں ـــ دُکھی آنکھوں میں بینائی کی بُوندوں کو ابھی گیلا ہی رکھتے ہیں کہ ہم کو اپنی نظروں کے قلم سے اِس زمانے کے بدن پر شوخ رنگوں میں وُہ سب کچھ عام کرنا ہے جسے ہم نے چھپا کر اپنے دِل کے اہراموں میں بند رکھا ہُوا تھا۔

مگر ہم نے خزانے کو کہاں سِم سِم کی چابی سے نوازا تھا کہ اب تک کوئی تو اُس کے معانی تک پہنچ پاتا ـــ مگر شاید ابھی کچھ وقت باقی ہے۔ سو آؤ ہم بجھے لفظوں کو پڑھنے کا یہ دھندا چھوڑ دیتے ہیں ـــ کسی پتھر کو سِم سِم کی وُہ چابی دان کرتے ہیں کہ جس سے سیم و زر کے سب کھلونے اِک پل میں سنگ کے سینے سے باہر کو لپک آئیں گے!

اِس نظم کو زوالِ عُمر کی نظم کہنا زیادتی ہے۔ ٹیپ کے مصرعِ "چلو آرام کرتے ہیں" کو اگر کہیں بیچ میں یا نظم کے آخر میں دُہرا دیا جاتا تو اِسے زوالِ عُمر کی نظم کہہ دینے سے شاید کوئی فرق نہ پڑتا؛ لیکن اَب یہ نظم زوالِ عُمر کا نُوحہ نہیں؛ اِس بات کی شکایت ہے کہ جب ہم نے خود ہی اپنے بجھے لفظوں کے خزانوں کو کھولنے والی سِم سِم کی چابی چھپا دی تھی؛ تو کیسے کوئی اُن کے معانی تک پہنچتا! شاعر کی شکایت تو بجا ہے لیکن اِس کا اِزالہ جس تجویز میں مُضمَر ہے؛ اُس پر بھی اُسے پُورا بھروسا نہیں "مگر شاید ابھی کچھ وقت باقی ہے" کے اِعلامیے کے بعد، نظروں کے قلم سے بنائے ہوئے مختلف النوع شاہکاروں کو؛ جو دِل کے اہراموں میں بند ہیں؛ عام کرنے کے لیے شاعر سِم سِم کی وُہ کلید پتھر ہی کو بخش دیتا ہے جس سے :

سیم و زر کے سب کھلونے
سنگ کے سینے سے باہر کو
لپک آئیں گے پَل بھر میں!

پتھروں سے اُن کی طبعی عُمر کا اندازہ لگانا یا یہ معلوم کرنا کہ وُہ کب گھڑے گئے تھے، کاربن ڈیٹنگ (Carbon Dating) کے حوالے سے اَب ایک مسلّمہ سائنسی اَمر ہے؛ اِس کے باوجود مصر کے اہراموں کی گتھی نہیں سُلجھی: تو کیا اِس میخی رسمُ الخط میں مُندرِج عبارت کو پڑھ کر بھی کوئی صحیح معانی کے خزینوں تک پہنچ پائے گا؛ کیا شاعر کے دِل کے اہراموں میں بجھے لفظوں کا قصیدہ جُوں کا تُوں مخفی رہے

گا ــــ عجیب پیچیدہ سوال ہے!

خزاں کے زمستاں میں بدلنے کا نوحہ ہم سُن چکے۔ اَب "نَو ہی برس میں" کو دیکھتے ہیں۔ ادھیڑ عُمر سے "کہن بڑھاپا" کیا صرف نَو ہی برس کی دُوری پر ہے ــــ نَو کا ہندسہ ایک طلسمی عدد ہے' اِس بات کا اَندازہ ہم سب کو ہے, لیکن کیا یہ "تھری سکور اینڈ ٹین" سے نَو برس آگے جانے کی بات ہے یا اِس سے بھی کہیں آگے کے نَو برس لمبے سفر کی رُوداد ہے ــــ اِس بات کا اَندازہ صرف اُن بخیوں کو ہے جو ٹُوٹ کر گِر چکے ہیں اَور اِس عمل میں "چوغے سارے اُدھڑ گئے ہیں"۔ لیکن ایک بار پھر صوتی محاکات کی قربانی دیتے ہُوئے اِس نظم کو بھی نثر میں لکھ کر دیکھتے ہیں:

نَو ہی برس میں بخیے سارے ٹُوٹ گِرے ہیں' چوغے سارے اُدھڑ گئے ہیں ــــ کسے بتائیں' اَرض و سَما میں کپڑے کی چھانٹوں کے گچھے بے پَر کی پرواز میں گم ہیں!

یُوں لگتا ہے جیسے اَب اِس عالَم کی پوشاک گھنے ٹانکوں کے کُھل جانے سے ایک ہی پَل میں دھیرے دھیرے پھیتی پھیتی ہو جائے گی! کوئی تو ہو ہم جسے بتائیں' اِک دِن ایسا بھی آئے گا، جب اِس پھٹے پُرانے عالَم کا اِک نیا لباس سِلے گا؛ بخیہ گری کا ایک نیا منظر پھُوٹے گا اَور ہم چھوٹے چھوٹے ٹانکے پھر سے رقصاں ہو جائیں گے' جُڑنے جوڑنے لگ جائیں گے۔

میں نے اِس نظم کو ایک نثری قاش کی صورت میں لکھ تو دیا ــــ کیا کھویا' کیا پایا' اِس سے قطع نظر ایک ہی نظر میں (اَب مجھے یہ آسانی ہو گئی ہے)، بخیوں کے ٹوٹ کر گِرنے (صرف ٹُوٹنے نہیں) چوغوں کے اُدھڑنے' کپڑے کی چھانٹوں کے گچھوں کے اِدھر اُدھر اُڑنے کا سینار یو ــــ پُورے عالَم کے پھیتی پھیتی ہو جانے کا منظر نامہ ــــ ایک متحرک سلائیڈ شو کی طرح آسانی سے دیکھ سکتا ہوں۔ واحد سے جمع تک' خود سے عالَم تک' اِکائی سے کلّیت تک' مائیکرو کازم سے میکرو کازم تک' نَو ہی برس میں سب کچھ تو ریزہ ریزہ' پھیتی پھیتی' لیر لیر ہو چُکا ہے، لیکن کیا کوئی ہے ("کوئی تو ہو" ــــ شاعر پُوچھتا ہے ــــ کون؟ خُدا؟ خالقِ عالَم؟) جو اُسے تسلی دے کہ اِس مائیکرو کاسمک ذرّے سے لے کر (جو واحد ہے' اِکائی ہے) میکرو کاسمک آفاق تک (جو کلّیت ہے) دوبارہ جُڑ جائیں گے! اَب تصویری مفاہیم کے حامل اَلفاظ "نیا لباس"، "بخیہ گری"، "چھوٹے چھوٹے ٹانکے" اپنی تصویروں کے ساتھ جلوہ گر ہو جاتے ہیں۔ ٹوٹ

کر گرنے کی جگہ "رقصاں ہونے" نے لے لی ہے۔ گویا ایک نئی زندگی کی شروعات ہے۔ اِکائی سے کلّیت تک، سب ذی رُوح (اور اَشیا) ایک نیا جنم لے رہے ہیں۔

تو کیا یہ نظمیں محض زوالِ عُمر کے احساس سے مملُوفن پارے ہیں ـــ جی ہاں، ہیں ـــ اَور جی نہیں، نہیں ہیں! اسٹیفن سپینڈر ہی نے ایک بار ٹی ایس ایلیٹ کے ایک تجزیے کے بارے میں {جو اُس نے سترھویں صدی عیسوی کے میٹا فزیکل شاعر ڈن (Donne) کے بارے میں کیا تھا} کہا تھا:

> If a lesser poet had said this thing about Donne, even I would have found it unacceptable: Remember, my friends, it is Eliot who has said it.

تو وزیر آغا کے پاس کیسا طلسمی قلم ہے جو بظاہر توصراحت کی زیریں سطح پر ایک نستعلیق اَور شفاف بات، بغیر کسی تردّد کے، لکھتے چلا جاتا ہے؛ اَور جب لکھ چکتا ہے تو شاید خود ہی پلٹ کر دیکھتے ہُوئے اِستعجاب کے لہجے میں، چابک دستی سے چھوڑے ہُوئے اپنے اِشاروں اَور کنایوں کو دیکھتا ہے، اَور پھر مسکراتے ہوئے، ایک آنکھ دبا کر، زبان سے اپنی شناسائی، اِرتسام، وِرایت اَور دریافت کی ہمہ گیری کو آموختہ یا ناظرہ جان کر جیسے خود ہی سے کہتا ہے: ارے، یہ میں نے کیا لکھ دیا ـــ یقین نہیں آتا لیکن جو کچھ لکھا ہے، وُہی تو میں لکھنا چاہتا تھا!

(۵)

کئی نئی نظمیں ایسی ہیں جنھیں سمجھنے کے لیے وزیر آغا کے مضامین کو کھنگالنا پڑتا ہے۔ "تخلیقی عمل" کے بعد اِسی قبیل کی جو تحریر پڑھنے کو ملی، وہ کاغذی پیرہن' میں اُن کا ایک مضمون تھا، جسے پڑھتے ہوئے میں کئی دِنوں تک اپنے نوٹس بناتا رہا اَور درجنوں کتابوں کے صفحات پر سطروں کو نشان زد کرتا رہا:

> ـــ طبیعیات نے جس تخلیقی عمل کو نشان زد کیا ہے، وہ اُنھیں تین مراحل پر مشتمل ہے جن کا ذکر "تخلیقی عمل" میں کیا گیا تھا، یعنی نراج (chaos)، جست اَور تجسیم! فرق یہ ہے کہ فنونِ لطیفہ کے حوالے سے تخلیق کار کے اعماق میں ایک ایسی کیفیت جنم لیتی ہے جو ایک بے جہت، بے صُورت "مہا احساس" پر مشتمل ہوتی ہے۔ یہ احساس نراج کے عالَم میں ہوتا ہے، مگر پھر اپنی ساری داخلی قوت کو یکجا کر کے،

ایک ایسی جست بھرتا ہے جو لَے اِس عالَم سے آزاد کر کے "چیزے دیگر" بنا دیتی ہے ـــــ نراج کے اِس عالَم سے ایک کوندا لپکتا ہے ـــــ یہ بِگ بینگ ہے جس سے ہماری اِس کائنات کی اِبتدا ہُوئی تھی۔ جست اَور کوندا اپنی Thrust کے اعتبار سے ہم معنی ہیں لیکن جست کی کارکردگی زمینی مظاہر تک ہے ـــــ فنونِ لطیفہ کے حوالے سے یہ وُہ مرحلہ ہے جہاں تخلیق کار کے اَندر سے باہر کی طرف لپکنے والی جست اپنے لیے شباہت، صُورت یا بدَن کا اہتمام کرتی ہے اَور سنگ، سُر، رنگ یا لفظ کے ذریعے فنی تخلیق میں مجسّم ہو کر سامنے آجاتی ہے ـــــ اِس تخلیق کا ایک میکرو رُخ بھی ہے اَور ایک مائیکرو رُخ بھی۔

ـــــ مگر سوال یہ ہے کیا ہم Ultra Microscopic Level کو ملٹی وَرس (Multiverse) کی آخری حد قرار دے سکتے ہیں؟ اِس سلسلے میں سائنس دان تیقّن سے کچھ نہیں کہ رہے؛ تاہم بعض سائنس دانوں کا خیال ہے کہ جس آخری حد کو ہم "سب کچھ" کہ رہے ہیں کیا عجب کہ وُہ "اصل حقیقت" کا محض ایک پرت ہو! ایسی صُورت میں صاف دِکھائی دیتا ہے کہ طبیعیات، مابعدُالطّبیعیات میں ضم ہو کر اُس عظیم ترین حقیقت کا اِقرار کرنے لگی ہے جو تمام قوتوں اَور تمام تر اَجزا کو اپنی بے نہایت کشش کے ہالے میں سمیٹے ہُوئے ہے اَور جو تخلیقی عمل کا منبع اَور مصدر ہے۔

مائیکرو لیول کی اِس کارکردگی کو بے حد خوبصورتی سے "تخفیف" میں نظم کیا گیا ہے:

اِک جہت نا آشنا صُورت
جو صُورت بھی نہیں ہے
وہ اپنے آپ پر اوندھے پڑی ہے
وہ ایسی بے بدَن ہے
زماں بھی اُس کے مَرقد میں
قدم رکھنے سے قاصر ہے!

عجب تخفیف ہے وُہ
کسی تقسیم کا اِمکان بھی
جس میں نہیں ہے
"نہیں" کی آخری حد سے بھی آگے

اِک اَیسا بے نہایت عکس جس کا
نہ اَندر ہے نہ باہر ہی کہیں ہے
مجھے دیکھو
میں اِس تخفیف کو اوڑھے کھڑا ہوں!!

اِس نظم کو تجزیاتی عمل سے گزارنا اِس لیے ضروری نہیں کہ وزیر آغا کے مندرجہ بالا اِقتباسات سے جن نئی نظموں کا براہِ راست تعلق تلاش کیا جا سکتا ہے' اُن میں یہ بھی ایک ہے۔ اِسی طرح "مجھے اَب کچھ نہیں کرنا" کو بھی اِن اِقتباسات کی روشنی میں پرکھا جا سکتا ہے۔ یہ ایک مکمل نظم ہے جس کی نامیاتی وَحدت اگر مجروح نہ ہو تو میں کچھ ایسے اِقتباسات دینے کی جسارت کرنا چاہوں گا جو قوتِ باصرہ سے تعلق رکھتے ہیں اَور جنھیں نظم کی قلبِ ماہیت کی دھڑکن کی طرح سنا جا سکتا ہے:

مجھے اَب کچھ نہیں کرنا
مجھے خوابوں کی چھتری تھام کر
صحراؤں کے بنتے بگڑتے
ریت کے ٹیلے نہیں گننا
مجھے نیلے سمندر پر اُتر کر
بادبانوں کو نہیں چھونا
مجھے پانی کے صحرا میں
سَرابوں کا تماشا بھی نہیں تکنا
مجھے گنجان شہروں کی بجھی گلیوں
کے اَندر بھی نہیں جانا
مجھے کچھ بھی نہیں کرنا
مجھے اِن اَن گِنت آنکھوں کے پیچھے
بیکراں اِک آنکھ کی موجودگی محسوس کرنا ہے
جو اَصلاً صرف بینائی ہے
مجھے اِس بیکراں بینائی کے اَندر اُترنا ہے

اَب اگر بغور ''نہیں گننا''، ''نہیں چھُونا''، ''نہیں تکنا''، ''نہیں جانا''، ''نہیں کرنا'' کی اِنحرافی ردّوقدح اَور منفیانہ رویّے سے آگے بڑھیں اَور پُوچھیں ــــ ''تو کرنا کیا ہے؟'' تو اِثبات و اقرار کی ایک جہت سامنے آتی ہے ــــ جی ہاں ــــ ''مجھے اِن اَن گِنت آنکھوں کے پیچھے بیکراں اِک آنکھ کی موجودگی محسُوس کرنا ہے'' (جو اصلاً صرف بینائی ہے) ــــ اَور پھر ــــ ''مجھے اِس بیکراں بینائی کے اَندر اُترنا ہے''۔
اَب لَوٹ کر وزیر آغا کے مضمون کے اِس اِقتباس پر جائیں:

ــــ طبیعیات، مابعدُالطّبیعیات میں ضم ہو کر اُس عظیم ترین حقیقت کا اِقرار کرنے لگی ہے جو تمام قوتوں اَور تمام تر اَجزا کو اپنی بے نہایت کشش کے ہالے میں سمیٹے ہوئے ہے اَور جو تخلیقی عمل کا منبع اَور مصدر ہے۔

تو ہمیں اِس بات کا احساس ہوگا کہ وزیر آغا ایک ثابت و سالم حسّیت اَور معتدبہ حصّۂ علمیّت' دونوں کے مالک ہیں: اُن کی شاعری اَور اُن کے فلسفۂ حیات میں کوئی بُعد نہیں۔ یہ بات اِس اِقتباس اَور درج بالا نظم کو پڑھے بغیر واضح نہیں ہوگی۔

(۶)

مقدّس اِنجیل میں آدمی کی عمر ٹھہری سکور اینڈ ٹین'' یعنی ''تین کوڑی اَور دس'' لکھی گئی تھی۔ ستّر برس کی عُمر کا یہ مقدّس مفروضہ اَب ایک ضربُ المثل کے طَور پر زیادہ اَور اِلہامی ہندسے کے طَور پر کم اِستعمال ہوتا ہے۔ وزیر آغا کی اِسی عنوان کی ایک نظم (جو شاید ستّر برس کی عُمر میں لکھی گئی)' اُن کے شعری مجموعے ''یہ آواز کیا ہے'' میں شامل ہے۔ اِس نظم کا آخری حصّہ مجھے، خُدا جانے کیوں، سِسٹین چیپل (Sistine Chapel) کے گنبد کی اَندرونی چھت کی یاد دِلاتا ہے؛ لیکن پہلے نظم دیکھیں:

میں جب کوزے کا غذ اَیسا
کھڑکھڑ کرتا، شور مچاتا اِک بچّہ تھا
میری ماں مجھ سے کہتی تھی:
چُپ کر

اِتنا شور کیا تو تیری
ننھی بہنا جاگ اُٹھے گی
جاگ اُٹھی تو
دُور پہاڑ کی اُس چوٹی سے
بادل ایسی
لمبی چِٹی ڈاڑھی والا کالا بابا
نیلی پیلی آنکھیں جس کی
سُرخ عُنابی منکوں کی اِک مالا پہنے
مُٹھی میں اِک چِمٹا تھامے
پنجے میں کشکول اُٹھائے
بھاپ اُڑاتا، شور مچاتا
دھڑ دھڑ نیچے آجائے گا
اور کالے کشکول میں تجھ کو ڈال کے
پربت کی چوٹی پر لے جائے گا!
ماں کہتی تھی
اور مَیں ماں کی گود میں
ڈر کر سو جاتا تھا
آج مگر میں جان گیا ہوں

بابا — اِک دِن

پربت سے سچ مچ آیا تھا
گھر کے اَندر آن گھسا تھا
اَور مجھے
کشکول میں اپنے ڈال کے
کتنا سکھی ہُوا تھا
بھکشا لے کر

بھکشا پاتر کو لہراتا
بھاگ گیا تھا!

سڑ، کھڑ کھڑ کرتے،
شور مچاتے سال تو سارے
اِک لمحے میں بیت گئے ہیں
اور پربت کی چوٹی پر
مَیں ــــ بادل ایسی
ڈاڑھی والا کالا بابا
کاغذ کا کشکول اُٹھائے
سوچ رہا ہوں:
کیا مَیں بھی اُس
پربت کی چوٹی سے اُتروں!
نئے جنم کی بھکشا لینے
میں بھی جاؤں!!

ویٹیکان (روم) کا سسٹین چیپل، پوپ Sixtus IV کے زیرِ ہدایت تعمیر کیا گیا تھا۔ اُس کے گنبد کی اندرونی چھت پر مختلف النوع تصاویر ہیں جنھیں دیکھنے کے لیے ہزاروں سیاح روزانہ آتے ہیں۔ یہ فریسکوز (Frescoes) شہرۂ آفاق آرٹسٹ مائیکل انجیلو (۱۹۶۴-۱۹۷۵ء) کے بنائے ہُوئے ہیں۔ ایک فریسکو میں ایک نورانی رِیش والے دَرویش نُما پیر مَرد کو، پرواز کرتے دِکھایا گیا ہے۔ اُس کے بال ہَوا میں اُڑ رہے ہیں۔ ایک ہاتھ کچھ ایسے اِشارہ نُما ہے جیسے کوئی پیغام دے رہا ہو یا کسی کو اَپنے قریب آنے کی تلقین کر رہا ہو۔ نورانی چہرے والے اُس پیر مَرد کی متحرک تصویر کے عین نیچے ایک نوجوان کی شبیہ ہے جو اَپنے ہاتھ پھیلائے ہُوئے ہے، جیسے اُس پیر و مُرشد سے کچھ لینے کے لیے بے تاب ہو۔ یہ نوجوان تازگی، بشاشت، بے رَیب و رِیا معصومیت کا مرقع ہے ــــ بڑی بڑی آنکھیں اُمید اَفزائی کی علامت کے طَور پر کُھلی ہیں ــــ

وزیر آغا کی یہ نظم اَور اُن کی یہ نئی نظمیں پڑھنے کے بعد مجھے یہ فریسکوز کیوں یاد آئے ـــــ میں نے خود سے پُوچھا ـــــ جواب مِلا:

تمھیں یہ احساس ہُوا کہ بزرگی اَور بصیرت کی یہ تصویر آج کے وزیر آغا کی ہے جو "بادل ایسی ڈاڑھی والا کالا بابا" بن چکا ہے؛ دُنیا بھر کا گیان اکٹھا کر چکا ہے ـــــ نوجوان گزرے ہُوئے کل کا وزیر آغا ہے جو اپنے آنے والے کل کی شبیہ پر بندگی اَور عقیدت کی نظر اِس اُمید سے مرکُوز کیے ہُوئے ہے کہ کبھی تو وُہ وِدّیا، گیان اَور بُودھ کا اَیسا مرقع بنے گا!

ستیہ پال آنند

وزیر آغا کی نظم میں سادہ زبان اور مختصر مصرعوں کے استعمال کا جو رجحان "آدھی صدی کے بعد" (۱۹۸۱ء) سے شروع ہوا تھا وہ دھیرے دھیرے "اک کتھا انوکھی" (۱۹۹۰ء)، "عجب اک مسکراہٹ" (۱۹۹۵ء)، "چنا ہم نے پہاڑی راستہ" (۱۹۹۹ء) اور "ہم آنکھیں ہیں" (۲۰۰۱ء) سے آگے بڑھتے بڑھتے بلکہ ایک نئی نظم کی ہیئت اختیار کر گیا ہے۔ یہ ہیئت وزیر آغا نے نہایت خاموشی سے خود ہی متعارف کروائی تھی، لہٰذا وہی اس کے رجحان ساز ہیں۔ دوم علامتیں پیچیدہ تر ہو گئی ہیں اور شاعر کی ذہنی اُپج تک رسائی حاصل کرنے کے لیے علامتی شعرا کے طریقِ کار کا متین مطالعہ ضروری ہو گیا ہے۔ سوم فلسفے کا عمل بڑھ گیا ہے نتیجتاً نظم کا ترسیلی تحرک ذہنِ رسا کا متلاشی رہتا ہے اور چہارم نظم نامحسوس انداز میں داخلی اکائی پر زیادہ زور دیتی ہے ـــــ یہ اجزائے اربعہ وزیر آغا کی نظم کو ایسا جمال عطا کرتے ہیں جو آنکھوں کو خیرہ نہیں کرتا بصارت و بصیرت میں اضافے کا باعث بنتا ہے۔ اسے انسانی سائیکی کے حوالے سے تفتیشِ ذات کے اہم مدارج میں شمار کر لیا جائے تو حقیقتِ عظمیٰ کی بوقلمونی سے لطف اندوز ہونے والے وزیر آغا کی نظموں کے پس ساختیاتی پہلوؤں کو سمجھنے میں آسانی پیدا ہو سکتی ہے۔

وزیر آغا کے نظامِ فکر و شعر میں مشرقی تہذیب کی شائستگی، آشفتگی اور رمز و ایما سب موجود ہیں مگر شعر کا نبھاؤ (treatment) اُن کا اپنا ہے۔

امین راحت چغتائی ـــــــــــــــ